شہزاد اسلام
ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری
(سابق) پرنسپل اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

تانیثیت: نظریہ اور تاریخ کے تناظر میں

Shahzad Islam
Research Scholar Ph.D, Oriental College, Punjab University, Lahore.
Dr. M. Fakhar ul Haq Noori
(Ex) Principal Oriental College, Punjab University, Lahore.

Femininity: in the Context of Theory and History

Feminism is a philosophy or ideology in which the pivotal significance is given to the identity of a woman. The feminist movement has a long history of struggle to equal and empower the women. Feminism formulates an integral concept of the feminist movement that promotes gender equality and opposes perpetuation of gender discrimination at economic, social and cultural front. In the 19th Century feminism has taken its proper shape in western literature, but in Urdu literature, only a few feminist writers, especially Kishwar Naheed, Fahmida Riaz, Ismat Chughtai and Qurat ul ain Haider etc have written about women feelings, passions, imaginations, sincerity, sacrifices and selfless love in their works. In short, the theme of this article revolves around the analysis of feminist movement, in the light of feminist ideology and history.

Keywords: *Feminism, Gender discrimination, Feminist Movement, Women's Rights, French Revolution, Domestic Violence.*

تانیثیت عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لیے انگریزی میں فیمنزم (Feminism) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جو لاطینی زبان کے لفظ فے مینا (Femina) سے مستعار ہے، جس کے معنی "نسوانی خصوصیات کا حامل ہونا" کے ہیں۔[1] ابتداً فیمنسٹ (Feminist) کا لفظ نسوانی خصوصیات کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، تاہم

بعد میں جب فیمینسٹ (Feminist) کا لفظ فیمنزم (Feminism) کے معنی میں تبدیل ہو کر بہ طورِ اصطلاح استعمال ہونے لگا تو فیمنز م (Feminism) کی اصطلاح عورتوں کی تحریکات سے ہمیشہ کے لیے پیوست ہو کر رہ گئی۔ واضح رہے کہ لاطینی زبان میں (Feminism) کے معنی "عورت" فرانسیسی میں "عورتوں کے حقوق" اور انگریزی میں "جنسی برابری" کے ہیں، جب کہ اُردو میں فیمنز م (Feminism) کے لیے مناسب ترین لفظ "تانیثیت" ہے، جو بہ طورِ اصطلاح اُردو ادبیات میں اپنی مُستقل پہچان بنا چکا ہے۔ جہاں تک لفظ فیمنزم (Feminism) کے بہ طورِ اصطلاح استعمال کا تعلق ہے تو اِس ضمن میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ۱۸۷۱ء میں فیمینسٹ (Feminist) کا لفظ فرنچ میڈیکل ٹیکسٹ میں پہلی مرتبہ ایسے (مرد) افراد کے لیے استعمال کیا گیا، جو نسوانی خصوصیات کے حامل تھے،[۲] جب کہ فیمینزم (Feminism) کی اصطلاح سب سے پہلے ایک فرانسیسی مثالی سوشلسٹ مفکر چارلس فوریئر (Charles Fourier) (۱۷۷۲ء۔۱۸۳۷ء) نے وضع کی،[۳] لیکن محلِ نظر رہے کہ ماضی میں تانیثی تحریک سے منسلک خواتین کے لیے Womanist کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی تھی۔ مزید یہ کہ ایک خاص دور تک "کاز" کا لفظ بھی تانیثی مسائل کے اظہار کے لیے ناقدینِ فن کے زیرِ استعمال رہا، تاہم فی زمانہ تانیثیت کا لفظ ہی اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایک ایسی تحریک کا درجہ اختیار کر چکا ہے، جس کا اصولی مقصد نہ صرف عورتوں کو اُن کے جائز حقوق اور سماجی سطح پر اُن کا اصل مقام دلانا ہے، بل کہ خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک، یعنی مردوں کی بالادستی، جبر واستبداد اور عدم مساوات کا جابرانہ رویہ ایسے پہلوؤں کی بیخ کنی کرنا بھی ہے۔[۴] بہ قول آزاد ایوب بٹ:

> **"تانیثی تحریک کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ لفظ حقوقِ نسواں، تحریکِ نسواں، نسائیت یا کئی ایسے دوسرے الفاظ جو عام طور سے عورتوں کے حقوق کے اظہار کے لیے اصطلاح کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، وہ انگریزی اصطلاح فیمینزم (Feminism) کے متبادل نہیں ٹھہرتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان الفاظ کے معنی محدود ہیں، جن سے تانیثی تحریک کی برابر عکاسی نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے انگریزی لفظ فیمنزم (Feminism) کے لیے اُردو میں "تانیثیت" کا لفظ ہی موزوں و مناسب ٹھہرایا گیا۔ یہ لفظ اس تحریک کے اغراض و مقاصد کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔"[۵]**

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

اِس امر میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ تانیثیت کا تصور بیک وقت ایک سماجی نظریہ بھی ہے اور سیاسی تحریک بھی، جس کے ذریعے عورت کے معاشرتی مقام و مرتبہ اور کردار کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ گویا نسائی تحریک اپنی زیادہ تر صورتوں میں صنفی مساوات کی مقتضی ہے،(۶) جس کا کلیدی مقصد یہ ہے کہ صنف کی بنیاد پر عدم مساوات کے حوالے سے احتجاج و للکار کا رویہ اختیار کیا، تاکہ عورتوں کو ان کے جائز حقوق حاصل ہو سکیں۔ فی الاصل خواتین کے حقوق کے ضمن میں کہیں تہذیب و تمدن اور کہیں مذہب و ملت کے نام پر یہ صنفی امتیاز عالم گیر سطح پر عورتوں کے ساتھ زمانۂ قدیم سے برتا جارہا ہے، جس کی روک تھام کے لیے تحریکِ نسواں اپنا فعّال کردار ادا کرتی چلی آرہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی کے باوجود انسانی سماج تا حال اِس معمولی سی بات کو سمجھ نہیں پایا کہ عورت فکری اور سماجی سطح پر مرد کے برابر مقام و مرتبہ کی حامل ہے اور اس کے لیے اس کا فکری و شعوری ارتقا اتنا ہی ناگزیر ہے، جتنا کہ مرد کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تانیثیت محض ایک ادبی نظریہ سازی ہی نہیں، بل کہ سماجی، ثقافتی اور تاریخی تشکیلات کا واضح اظہار بھی ہے۔(۷) یہی وجہ ہے کہ تانیثی تحریکات میں عورت کے وہ تمام مسائل، جو اس کے آنسوؤں سے لے کر اس کی مسکراہٹ تک کی ساری کہانی بیان کرتے ہیں، اُن سب کا تفصیلی ذکر کیا جاتا ہے۔ یوں تو تانیثی تحریک کے حامل افراد کے مقاصد کی فہرست خاصی طویل ہے، تاہم عورتوں کی خفتہ صلاحیتوں کو جلا بخشنا، مساویانہ حقوق کی دست یابی، نسائی حقوق کی بحالی، خواتین کی عزت و توقیر کی پامالی کرنے والے ظالم ارزال اور سفہا کے چہروں کو بے نقاب کرنا، نسائی اقدارِ عالیہ کو تحفظ فراہم کرنا، انسانی سماج میں جنسی جنون اور ہیجان کی مسموم فضا کا قلع قمع کرتے ہوئے حاشیہ بردار خواتین کو ان کے حقوق کی فراہمی کے لیے تگ و دو کرنا بھی تانیثی تحریک کے اساسی مقاصد میں شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ فی زمانہ نسائی شعور کا مطالعہ نسوانی تحریک کے بجائے ایک دبستان کی صورت میں ڈھل چکا ہے(۸) گویا تانیثیت کا بنیادی مقصد نسائی حقوق کی بحالی اور عورتوں کے سماجی مقام و منصب کا تعین کرنا ہے۔ چوں کہ ادب میں تانیثیت کے مباحث گذشتہ دو سو سالوں سے زیر بحث رہے ہیں، جن میں تانیثیت کے علم برداروں نے خواتین کی سماجی شناخت کی بازیافت، عورتوں کے استحصال اور محکومی و محرومی ایسے معاملات کو وکلا کی طرح منطقی و سائنسی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن دل چسپ امر یہ ہے کہ تانیثیت کی تحریک ایسی خواتین نے شروع کی تھی، جو سیاسی، سماجی اور معاشی عدم مساوات کے زخموں کو فی نفسہٖ سہ چکی تھیں۔(۹) تانیثی تحریک کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ پدری سماج میں عدم مساوات پر مبنی اصولوں اور فرامین کا خاتمہ کرنے کے بعد عدل و انصاف پر

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

مبنی ایک نیا سماجی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے۔ وہ اِس لیے کہ خواتین کے متعلق جس نوعیت کے تصورات و نظریات ہمارے سماج میں مروج ہیں، وہ اصلاً اور اصولاً سوسائٹی کی جانب سے وضع کردہ ہیں، جن کا حقیقت کی دُنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ [۱۰]

اِس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تانیثیت کا مقصد اس بے زبان اور لاعلم عورت کو Deconstruct کرنا بھی ہے، جو نہ صرف اپنی ذات سے بے خبر ہے، بل کہ وہ اس سماجی و تہذیبی صورتِ حال سے بھی نابلد ہے، جس کے جبر نے عورت سے اس کی پہچان تک چھین لی ہے، [۱۱] اِس امر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ خواتین نکاح، حقِ خلع، وراثت اور طلاق کے نتیجے میں بچوں کی تحویل کے حقوق اور جائیداد کے حصول سے ہمیشہ لاعلم رہی ہیں۔ مذکورہ مسائل کی نشان دہی اور تفہیم کے لیے اہلِ مغرب میں گذشتہ دو ڈھائی سو سال سے کئی ایک تحریکات برابر اپنا کردار ادا کرتی چلی آ رہی ہیں، جن کا واحد مقصد عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلوانا اور ساتھ ہی ساتھ مردوں کی اجارہ داری کا خاتمہ کرنا بھی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں پر روا رکھے گئے مظالم کے ردِ عمل پر تانیثیت کا تصور منصۂ شہود پر آیا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ نسائی تحریک کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کم تر درجے کی مخلوق ہرگز نہیں ہے۔ [۱۲]

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یونانی تہذیب میں عورت کو کوئی خاص مقام حاصل نہ تھا۔ یونانی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ عورت ایک ایسی مخلوق کا درجہ رکھتی تھی، جسے خدا نے محض مرد کو خوش رکھنے کے لیے تخلیق کیا تھا۔ [۱۳] اِسی طرح چوتھی صدی عیسوی میں الوارا کی مذہبی تنظیم نے جو فکری پرچار کیا، اُس کے مطابق عورت کو نہ صرف لکھنے پڑھنے کے حق سے محروم رکھنے کی سفارش کی گئی تھی، بل کہ یہاں تک کہا گیا تھا کہ عورت کو اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ اس کے نام کسی کے خطوط آئیں۔ بعینہٖ تورات میں شوہر کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ایسے مخاطب ہو، جیسے غلام یا بادشاہ اپنی رعایا سے خطاب کرتا ہے۔ یہودی مرد عمومی سطح پر یہ دُعا کیا کرتے تھے کہ اے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہمیں عورت نہیں بنایا۔ مزید براں سماجی سطح پر شوہر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق کا طوق پہنا کر خود سے الگ کر دے، مگر یہی کام اگر عورت کرنا چاہے تو اُسے اِس نوعیت کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اِسی طرح اگر اُس کے ہاں بچے کی پیدائش نہ ہو تو اس کی ساری ذمہ داری عورت پر ڈال دی جاتی ہے۔ ہندو دھرم میں مرد کی وفات کے بعد ستی ہو کر شوہر کے ساتھ ہی جل مرنے کی رسم بھی انسانی سماج کے ماتھے پر ایک بدنما داغ کی طرح واضح طور پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ مزید یہ کہ شوہر کی

میت نہ ملنے یا کسی دُور دراز مقام پر منتقل ہونے کی صورت میں عورت کو اپنے شوہر کی پگڑی اور جوتوں کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ اس مکروہ عمل کی نگرانی اس کے عزیز رشتے دار کیا کرتے تھے، تاکہ کہیں آگ کی تکلیف سے خوف زدہ ہو کر وہ عورت کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس لیے وہ اسے گہرے گڑھے میں ہاتھ پاؤں باندھ کر زندہ جلایا کرتے تھے، تاہم جن معاشروں میں مردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا، وہاں عورت کو مردوں کے ساتھ ہی دفن کرنے کی روایت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اِس نوع کی کارروائیوں سے سماج میں عورت کی حیثیت کم سے کم ترین ہوتی چلی گئی۔

مقامِ افسوس یہ ہے کہ خواتین پر جس قدر ظلم و جور مشرقی سماج میں روا رکھا گیا، اس کا عشرِ عشیر بھی دیگر مہذب معاشروں میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ مشرقی سماج میں عورت کو یہ شعور بہت کم رہا ہے کہ وہ مرد سے الگ بھی کوئی وجود رکھتی ہے۔ اس ذہنی پستی کی اساسی وجہ تو مشرقی معاشرے کی وہ روایات ہیں، جن میں عورتوں کو مردوں کے زیرِ سایہ زندگی گزارنے کی ترغیب نہ صرف بچپن سے دی جاتی ہے، بل کہ ایسا کرنے پر فخر محسوس کرنے کی تلقین بھی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی معاشرے میں عورتوں کو مذکورہ روایات کے زیرِ اثر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ عورت کو آج بھی بھیڑ بکریوں کی طرح ذاتی ملکیت خیال کیا جاتا ہے، جس کی واضح مثال بازارِ حسن کے نام پر بردہ فروشی کی وہ انسانی منڈیاں ہیں، جہاں عورتوں کو جنسِ بازاری کی طرح خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ اور تو اور پیدا ہونے سے پہلے ہی ماں کے پیٹ میں اس کے وجود کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے مٹا دیا جاتا ہے، شوہر کے ساتھ کئی کئی برس نبھانے کے باوجود کسی خفیف سی اتفاقی غلطی پر مرد جب چاہے تین حرفوں کی تلوار سے زندگی بھر کے ساتھ کی ڈوری کو کاٹ سکتا ہے۔ ماضی میں سیکڑوں کنیزیں بادشاہوں کا دل بہلانے اور جنسی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے رکھی جاتی تھیں، جن کی نگرانی غلام گردشوں کے بے رحم حاکم خواجہ سرا کیا کرتے تھے۔ اِسی طرح بادشاہ اور امرا اپنے دوستوں کو حوا کی بیٹیاں بہ طورِ تحفہ عنایت کیا کرتے تھے۔ یوں "زر" اور "زمین" کی معیت میں "زن" کا لفظ آمیخت کر کے عورت کو بھی نج کی پُونجی میں داخل کر لیا گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ پتھر کے دور سے تا حال یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مرد پیدائشی طور پر حاکم ہے اور وہ ہمیشہ حاکم ہی رہے گا۔ اِس ضمن میں جانثار مومن لکھتے ہیں:

> **"پدری سماج میں خواتین: فاتح افواج کے مالِ غنیمت کا اہم حصہ خواتین ہوتی تھی، جس کا بٹوارا بھی سامان کی طرح ہوتا تھا۔ ان خواتین کی اہمیت گھٹ کر کنیز اور لونڈی کی ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد مالک جنسی تسکین حاصل کریں یا تحفہ تحائف میں پیش کریں۔ جنگ**

> کی فتح کے بعد اہم خوش خبری خواتین کی گرفتاری ہوتی تھی۔خوب صورت خواتین حکمرانوں اور امرا کے حصے میں جاتی تھی، باقی سپاہیوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔"(۱۴)

تانیثیت کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ ۱۸۵۰ء کے قریب امریکا میں اِس کا آغاز ہوا، تاہم اِس سلسلے میں برطانیہ کے اہلِ فکر و دانش نے بھی تانیثیت کو ایک رُجحان کے طور پر تسلیم کروانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ تاریخی اعتبار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تحریکِ نسواں کے منشور کے بعض اہم نکات ۱۵۲۹ء میں لکھی جانے والی ایک جرمن فلسفی ہینرچ کورنیلیوس ایگریپا(Henrich Cornelius Agrippa)(۱۴۸۶ء۔۱۵۳۵ء) کی کتاب "Declamation on the Nobility and Preeminence of the Female Sex " میں بھی منتشر صورت میں موجود تھے۔ بعینہٖ برطانیہ کی ہی ایک اور مصنفہ جوڈِتھ سارجنٹ مری (Judith Sargent Murray)(۱۷۵۱ء۔۱۸۲۰ء) نے اپنے مضامین میں، جو اس عہد کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے تھے، اُن میں خواتین کے حقوق کے لیے نہ صرف صدائے احتجاج بلند کی، بل کہ تعلیم کی مدد سے خواتین میں آزادی کی رُوح پھونکنے کا بیڑا بھی اُٹھایا۔ اِس نوعیت کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُنیسویں صدی کے اوائل میں عورتوں نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کر دیا، تاہم یہ تمام کوششیں ایک منظم تحریک کی صورت میں اُس وقت مدغم ہو گئیں، جب ۱۸۶۹ء میں نیویارک میں حقوقِ نسواں کا پہلا کنونشن منعقد ہوا۔ اِسی دوران ایملین پینکھرسٹ(Emmeline Pankhurst) (۱۸۵۸ء۔۱۹۲۸ء) نامی ایک برطانوی سیاسی کارکن نے برطانوی سوسائٹی کی اصلاح کے لیے "Women's Social and Political Union" کے نام سے ایک انجمن قائم کی، جس کے ذریعے عورتوں کو سماجی و سیاسی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کی تربیت بہم پہنچائی گئی۔ ازاں بعد ایک فرانسیسی مصنف الیگزنڈر ڈوماس فلز (Alexander Dumas Fils)(۱۸۲۴ء۔ ۱۸۹۵ء) نے ۱۸۷۲ء میں "Humme Femme" کے نام سے ایک اہم کتاب تصنیف کی، جس کا اساسی موضوع تو معاشرے میں بڑھتی ہوئی بدکاری (Adultery) تھا، تاہم فاضل مصنف نے مذکورہ کتاب میں فیمینسٹ(Feminist) کا لفظ اختصاصی طور پر ایسی عورتوں کے لیے استعمال کیا، جن کا رویہ، مزاج اور سماجی برتاؤ مردانہ خصوصیات سے مملو تھا۔

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

خیال کیا جاتا ہے کہ تانیثی شعور کا سراغ بہ طورِ تحریک اپنی ابتدائی شکل میں انقلابِ فرانس(۱۷۸۹ء)کے بعد نمو پذیر ہوا۔۱۷۹۰ءمیں ایک آئرش مفکرایڈمنڈ برک (Edmund Burke) (۱۷۲۹ء ۔۱۷۹۷ء)نے مردوں کے حقوق اور بالادستی کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اپنی تصنیف "A Vindications of the Rights of Men"(۱۷۹۰ء) تخلیق کی تو اس نے تمام شعبہ ہائے زندگی کے اساسی پہلوؤں میں مرد کو عورت کے مقابلے میں برتر و اعلیٰ قرار دیا۔ایڈمنڈ برک کی اس کتاب کے جواب میں ردِ عمل کے طور پر اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک برطانوی مصنفہ میری وال سٹون کرافٹ (Mary Wollstonecraft) (۱۷۵۹ء۔۱۷۹۷ء) نے ۱۷۹۲ءمیں "عورتوں کے حقوق کی حمایت" (Vindication of the Rights of Women)نامی ایک کتاب تحریر کی، جس میں میری نے نہ صرف خواتین کے حقوق اور مساوات کے متعلق کھل کر اظہارِ خیال کیا، بل کہ اس نے ایسے تمام تصورات و نظریات کو یک سر رد کر دیا، جو محض مردوں کی برتری و بالا دستی کے حامل تھے۔اس نے مردوں کے سماج میں ان کے اپنے وضع کردہ غیر فطری اور غیر انسانی نظریات کو باطل قرار دیتے ہوئے اُن کی شدید الفاظ میں مذمت کی۔یہی وجہ ہے کہ میری کی مذکورہ تصنیف کو تانیثی فکر و اشاعت کے ضمن میں "نقشِ اوّل" قرار دیا جاتا ہے، جس میں فاضل مصنفہ نے حقوقِ نسواں کے ساتھ ساتھ شعورِ نسواں کی بے داری کا بھی زبردست فریضہ انجام دیا۔یوں تانیثیت کے موضوع پر خال خال تحریریں منظرِ عام پر آنے لگیں۔برطانیہ میں تانیثی رُجحانات کی حامل تحریکات نے آغاز میں ہی زور پکڑنا شروع کر دیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہاں تعلیمِ نسواں اور آزادیِ نسواں کے بارے میں مختلف تحریکوں نے خواتین میں شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔بالخصوص برطانوی مفکر جان اسٹیورٹ مل(John Stuart Mill)(۱۸۰۶ء۔ ۱۸۷۳ء)کی تصنیف "محکومیِ نسواں"(The (Subjection of Women) (۱۸۶۹ء)تانیثی تصورات کے فروغ میں "نسائیت کی بائبل"(۱۵)کی حیثیت رکھتی ہے۔

بعد ازاں ۱۹۲۰ءمیں ویرا بریٹن (Vera Britan) (۱۸۹۳ء۔۱۹۷۰ء)نے میری وال سٹون کرافٹ کے پیش کردہ خیالات کو کسی قدر زیادہ واضح انداز میں پیش کر کے تحریکِ نسواں کو مزید فعال بنانے کی سعی کی۔اِس سے قبل ناروے کی ایک معروف ڈراما نگار ہینرِک اِبسن(Henrik Ibsen) (۱۸۲۸ء۔۱۹۰۶ء)اپنے ایک ڈرامے "گڑیا گھر"(A Doll House) (۱۸۷۹ء)کی صورت میں مردوں کے استحصالی رویوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنا چکی تھی، گویا حقوقِ نسواں کی تحریک اقطاعِ عالم کی سیاسی و سماجی تحریک کے پس منظر میں پروان

چڑھی۔ خاص طور پر۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس کے بعد، جب حریت، مساوات اور اخوت (Liberty, Equality and Fraternity) کا تصور نمو پذیر ہونے لگا تو جہاں پسماندہ افراد میں اپنے حقوق کی بے داری کا جذبہ پیدا ہوا، وہاں عورتوں میں بھی اپنے حقوق کے حصول کے لیے ایک نیا جوش و ولولہ پروان چڑھنے لگا۔ یوں ۱۹۲۳ء میں جب حقوقِ انسانی کا چارٹر (Charter of Human Rights) وضع کیا گیا تو خواتین نے بھی اپنے حقوق کے حصول کے لیے بھرپور آواز بلند کی، تاہم ورجینیا وولف (Virginia Woolf) (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۴۱ء) نے اپنی تصنیف "ایک کمرا اس کا اپنا" (A Room of One's Own) (۱۹۲۹ء) میں پہلی مرتبہ واضح انداز میں تانیثی خیالات کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔ خاص طور پر تانیثی فکر و خیال کی ترویج میں ورجینیا وولف کو پہلی نسائی مصنفہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

بعد ازاں بیسویں صدی میں تانیثی شعور کی حامل تحریکات کے رُجحانات میں شدت پیدا ہوئی تو عالم گیر سطح پر حقوقِ نسواں اور آزادیِ نسواں کی تحریکیں متحرک ہوئیں، جن کے نتیجے میں دُنیا کے مختلف ممالک میں عورتوں کے حقوق کی رائے دہی کے مطالبے کو تسلیم کیا جانے لگا، چناں چہ امریکا کے بیشتر علاقوں میں ۱۹۲۰ء میں ، برطانیہ میں ۱۹۲۸ء میں، فرانس میں ۱۹۴۴ء میں، جب کہ اٹلی میں ۱۹۴۵ء میں عورتوں کے اس سیاسی حق کو تسلیم کر لیا گیا۔ گو کہ اس دور میں دُنیا کی مختلف حکومتوں کا رویہ عورتوں کے حوالے سے ہمدردانہ ہونے کے بجائے بڑی حد تک جابرانہ تھا، تاہم اِس کے باوجود اس دور میں عورتوں کے حقوق کے لیے مختلف کلب قائم کیے گئے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے کی جانے والی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ یوں اس مزاحمت پر مبنی رویے نے عالم گیر سطح پر توجہ حاصل کر لی۔ یوں خواتین کی اَن تھک جدوجہد کے طفیل بیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل تک دُنیا کے اکثر ممالک میں خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہو گیا، تاہم خیال رہے کہ تانیثی تحریک کا بنیادی مطالبہ محض حقِ رائے دہی کے حصول تک محدود نہیں تھا، بل کہ معاشی آزادی، ذاتی خود انحصاری اور مساویانہ طرزِ بود و باش کے حصول کا تقاضا بھی خواتین کی جدوجہد کے ایجنڈے میں شامل تھا۔

قطعِ نظر دیگر تخلیقی و عملی کاوشوں کے سیمون دی بوا (Simone de Beauvoir) (۱۹۰۸ء۔۱۹۸۶ء) کی کتاب "دی سیکنڈ سیکس" (The Second Sex) (۱۹۴۹ء) ہر حوالے سے نسائی تحریک کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے ذریعے سیمون دی بوا نے نہ صرف دُنیا بھر کی خواتین کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے کمر بستہ ہونے کے لیے تیار کیا، بل کہ اِس کے بعد عورتیں ذاتی نفع و نقصان کی پرواہ کیے بغیر اپنے صحیح

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

مقام کی تلاش میں راہِ عمل میں نکل کھڑی ہوئیں۔(۱۶)اِس ضمن میں میری ایلیمان (Mary Eliman) کی "Thinking About Women" (۱۹۶۸ء)، کیٹ ملٹ(Kate Millett) (۱۹۳۴ء۔۲۰۱۷ء)کی"Sexual Politics" (۱۹۷۰ء)،ایوا فجیز (Eva figes) (۱۹۳۲ء۔۲۰۱۲ء) کی "Patriarchal Attitude: Women in the Society"(۱۹۷۰ء)،ایلن مور(Ellen Moers) (۱۹۲۸ء۔۱۹۷۸ء)کی"The Literary Women"(۱۹۷۶ء)،ایلن شووالٹر (Elaine Showalter)(پ:۱۹۴۱ء)کی"A literature of their own" (۱۹۷۷ء)اور(Sandra Gilbert) (پ:۱۹۳۶ء)اورSusan Gubar(:پ۱۹۴۴ء)کی مشترکہ کاوِش "The Mad Woman in the Attic" (۱۹۷۹ء)ایسی تصانیف نے نہ صرف تانیثی تحریک کی نشر واشاعت اور ترقی وترویج کو مہمیز لگادی،بل کہ مذکورہ تصانیف کے منظر عام پر آنے کے بعد عالمی سطح پر ادب و شعر میں تانیثیت کا رجحان روزافزوں ہونے لگا۔(۱۷)علاوہ ازیں جولیا کرسٹیوا (Julia Kristeva)(پ:۱۹۴۱ء)، ہیلن سیزوس (Helene Cixous) (پ: ۱۹۳۷ ء)،ایلزبتھ ہارڈوِک (Elizbeth Hardwick) (۱۹۱۶ء۔۲۰۰۷ء)،جین آسٹن (Jane Austen)(۱۷۷۵ء۔۱۸۱۷ء)نے بھی نسائی طرزِ فکر کو آگے بڑھانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ بالخصوص جولیا کرسٹیوا نے نسائی مسائل کا مطالعہ گہرے فلسفیانہ انداز میں کیا۔یوں اقوامِ عالم میں حقوقِ نسواں کا تذکرہ زبانی و عملی دونوں سطحوں پر شدومد سے ہونے لگا، جس کے نتیجے میں خواتین پر ظلم وزیادتی کے خلاف صدابلند کرنے والوں کا غم وغصہ ایک مثالی صورت اختیار کر گیا۔یوں ۱۹۶۰ء کے بعد سماجی انتہا پسندی کے فروغ کے ساتھ ہی بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں تانیثی تحریک میں شدت آ گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگلستان میں ۱۹۷۵ء میں ایک ایکٹ کے تحت ایسے تمام امتیازات کو غیر قانونی قرار دیا گیا، جو صنفی اور جنسی سطح پر معاشی اور گھریلو زندگی میں عمومی طور پر خواتین کے ساتھ روا رکھے جاتے تھے۔

انگریزی ادبیات کے برعکس اُردو ادب میں تانیثی رُجحانات کی لہریں خاصی کم زور دکھائی دیتی ہیں، جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آج بھی اُردو ادب کے زیادہ تر قارئین تانیثی ادب سے مراد ایسا ادب لیتے ہیں، جسے محض خواتین نے خلق کیا ہو۔یہ بھی درست ہے کہ محض خواتین کی طرف سے تخلیق کردہ ہر تحریر کو بہ مشکل ہی تانیثیت کا نام دیا سکتا ہے،[۱۸] تاہم حقیقت یہ ہے کہ بعض افراد تو Female اورFemineایسی اصطلاحات کی بھول بھلیوں سے ہی ابھی تک باہر نہیں نکل پائے۔یوں یہ بات کہنے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا

چاہیے کہ مغرب کے برعکس ہمارے ہاں یہ رُجحان تاحال اُس نہج پر مربوط و منظم صورت اختیار نہیں کر سکا، جس کا تقاضا آج کی عورت کی مظلومیت کرتی ہے۔اِس کی بنیادی وجہ صدیوں کے پھیر میں سمٹی ہوئی ہماری وہ مشرقی و تہذیبی روایات ہیں، جنھیں ہمارا قدامت پسند سماج ترک کرنے کے لیے بالفعل قطعی آمادہ نظر نہیں آتا، تاہم خوش آئند امر یہ ہے کہ اس کے باوجود سیاسی و سماجی، تعلیمی و اقتصادی اور تہذیبی و ثقافتی گویا ہر سطح پر خواتین نے اپنی صلاحیتوں کا نہ صرف بھرپور اظہار کیا ہے، بل کہ شعر و سخن کی ہر صنف میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوایا ہے۔اِس ضمن میں ترنم ریاض (پ:۱۹۶۰ء) لکھتی ہیں:

> **"گذشتہ ایک صدی میں خاتون ناول نگار و افسانہ نگار، شاعرات، انشائیہ نگار، مزاح نگار حتیٰ کہ خاتون تنقید نگاروں نے اُردو ادب کی بقا میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ خاتون اُردو ادیباؤں کی خدمات کے پیشِ نظر، ان تحریروں کے موضوعات، زبان و بیان، مزاج اور ایک منفرد حسیت(Sensibility) کی بنا پر یہ تسلیم کرنے میں اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ادب ایک جداگانہ صورت اختیار کر چکا ہے ۔اس سارے سرمائے کو معقول دلائل کی بنا پر خواتین اُردو ادب یا تانیثی اُردو ادب کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔"(۱۹)**

جہاں تک برصغیر میں نسائی شعور کی ابتدا کا سوال ہے تو اِس ضمن میں رضیہ سلطانہ (۱۲۰۵ء۔۱۲۴۰ء)، چاند بی بی (۱۵۵۰ء۔۱۵۹۹ ء)، بیگم حضرت محل (۱۸۲۰ ء ۔۱۸۷۹ء)، شہزادی زیب النسا (۱۶۳۸ء۔۱۷۰۲ء) اور ملکہ نور جہاں (۱۵۷۷ء۔۱۶۴۵ء) کے نام برصغیر کی تاریخ کا انفرادی حوالہ ہیں، جنھوں نے غیر شعوری سطح پر اپنے مروجہ نسائی مقام و مرتبے سے آگے بڑھ کر کچھ ایسے کار ہائے نمایاں سرانجام دیے، جنھیں اس سے پہلے محض مردوں کے لیے ہی مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ بعینہٖ اُردو ادب کی تاریخ میں الف لیلیٰ کی شہر زاد اور امراؤ جان ادا کے کردار بھی عورت کے مسلمہ کردار سے بغاوت کی شبیہ پیش کرتے ہیں(۲۰)، جب کہ ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد سروجنی نائیڈو(۱۸۷۹ء۔۱۹۴۹ء) اور وجیا لکشمی پنڈت (۱۹۰۰ء۔۱۹۹۰ء) ایسی خواتین نے بھی مردانہ لیڈر شپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ کام کر کے تانیثی شعور کی ایک عمدہ مثال قائم کی ۔(۲۱) یوں مغربی اثرات کے زیرِ اثر برصغیر میں بھی حقوقِ نسواں اور تعلیمِ نسواں کو عام کرنے کے لیے مختلف تحریکات کا آغاز ہوا، لیکن عملی

سطح پر برصغیر میں عورت کی آواز وللکار کو اس وقت بڑے پیمانے پر سنا گیا، جب رُوس کے اشتراکی نظام نے برصغیر کی سماجی وسیاسی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

دل چسپ امر یہ ہے کہ ابتدائی سطح سے اُردو ادب میں تانیثی رُجحان کی غیر محسوس پرچھایاں ریختی، غزل اور ناول کی صورت میں موجود تو تھیں، مگر بعد ازاں بعض پڑھی لکھی خواتین نے بالخصوص اِس موضوع پر دانستہ وشعوری سطح پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اِس رُجحان کو اُردو ادبیات میں ایک اہم رُجحان کا حامل بنا دیا۔اِن خواتین نے زندگی اور سماج میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لیے بہ ذریعہ ادبی تخلیقات احتجاج کا بیڑہ اُٹھایا، لیکن آغاز میں ہماری خواتین شعرا کے کلام میں مرد شعرا کا سا انداز دیکھنے کو ملتا تھا، یعنی ابتداً اُن خواتین شعرا کے کلام میں اکثر محبوب کی بے وفائی اور اس کے جذبات کی ترجمانی نظر آتی تھی۔اس امر کی واضح ترجمانی اُردو کی ابتدائی صاحبِ دیوان شاعرات لطف النسا امتیاز (پ:۱۷۶۱ء)[۲۲] اور مہ لقاچندا بھائی (۱۷۶۸ء۔۱۸۲۴ء) کے کلام میں نظر آتی ہے۔خاص طور پر مہ لقاچندابائی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہم سے کرے ہے یار بیاں اپنی چاہ کا
حاضر ہیں ہم بھی گر ہو ارادہ نباہ کا

ذرا غور کیجیے کہ مہ لقاچندابائی مذکورہ شعر میں عاشق کو بغیر کسی لگی لپٹی کے بے وفا ہونے کا طعنہ دے رہی ہیں۔خیال رہے کہ ہماری فارسی اور اُردو کی شعری روایت میں عاشق کے بے وفا ہونے کا سرے سے تصور ہی موجود نہیں، لیکن مہ لقاچندابائی نے یہاں روایت سے ہٹ کر عاشق کو بے وفا کہہ کر نہ صرف روایت شکنی کا مظاہرہ کیا ہے، بل کہ لاشعوری طور پر تانیثی شعور کا اظہار بھی کیا ہے۔[۲۳] لطف النسا امتیاز اور مہ لقاچندابائی کے کلام کی اہمیت اپنی جگہ، تاہم اِس امر میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ اُردو میں نسائی ادب کا باقاعدہ آغاز تذکرہ نگاری سے ہوا، جس کا واضح ثبوت ۱۸۶۴ء میں فصیح الدین رنج (۱۸۸۵ء۔۱۹۳۶ء) کا "بہارستان ناز"، ۱۸۸۲ء میں عبدالحی صفا کا "شمیم سخن"، جب کہ ۱۸۷۸ء میں درگا پرشاد نادر کا "چمن انداز" ایسے تذکرے ہیں، جن کا حصہ بننے والی شاعرات کا تعلق زیادہ تر شاہی خاندان، معزز گھرانوں یا بازارِ حسن کی طوائفوں سے تھا۔گویا اِن تذکروں میں عام عورت کا سرے سے کوئی وجود ہی دکھائی ہی نہیں دیتا۔علاوہ ازیں برصغیر میں مسلمان صوفی شعرا نے بھی عورتوں کو اُن کے جائز مقام سے رُوشناس کروانے کے لیے اپنے کلام میں نسائی جذبات کی ترجمانی کی۔بالخصوص ہمارے صوفی

شعرا نے اپنے کلام میں عورتوں سے براہِ راست مخاطب ہو کر اُنھیں نہ صرف اُن کے سماجی مقام و مرتبہ سے آگاہ کیا، بل کہ اُن کی انفرادی حیثیت کو قبول کرتے ہوئے اُنھیں اپنی خفتہ صلاحیتوں کا شعور بھی دیا۔[۲۴]

ازاں بعد نسائی شعور کی ترویج و اشاعت میں علی گڑھ تحریک سے وابستہ اہلِ فکر کی علمی و ادبی نگارشات بھی خاص اہمیت کی حامل ہیں،تاہم واضح رہے کہ سرسید احمد خان(۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء)مولوی ذکاءاللہ(۱۸۳۲ء۔۱۹۱۰ء)،ڈپٹی نذیر احمد(۱۸۳۶ء ۔۱۹۱۲ ء)،نواب محسن الملک (۱۸۳۷ ء۔۱۹۰۷ء)، مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ ء ۔۱۹۱۴ء)،مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ ء۔۱۸۹۵ء)،مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء)،عبدالحلیم شرر(۱۸۶۰ء۔۱۹۲۶ء)اور راشد الخیری(۱۸۶۸ء ۔۱۹۳۶ء)ایسے ادبا عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مشروط داعی تھے،یہی وجہ ہے کہ اِن بزرگوں کی تخلیقات میں عورت کا تصور ایک مخصوص سماجی کردار کی حدبندیوں میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔یہ سب عورت کی تعلیم کے تحفظ کے ایک حد تک قائل تھے، جس کے حصول کے بعد وہ اپنے مروجہ کردار کو بہ خوبی نبھا سکے۔اِس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر راشد الخیری تک کے جملہ تخلیق کاروں نے عورت کے حوالے سے ناصحانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ مذکورہ حضرات کی تحریروں میں عورت کو اطاعت و فرماں برداری کا درس تو ملتا ہے، مگر وہ عورت کی باطنی کائنات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔[۲۶]بعد ازاں علی گڑھ کے پروردہ شیخ محمد عبداللہ (۱۸۷۴ء۔۱۹۶۵ء) اور سجاد حیدر یلدرم(۱۸۸۰ء۔۱۹۴۳ء)نے بھی تعلیمِ نسواں کے حوالے سے بہ کمال عملی کوششیں کیں۔اِسی طرح متعدد بااثر خواتین،جنھوں نے اُس عہد میں تعلیمِ نسواں کے حوالے سے نمایاں کردار ادا کیا،اُن میں بھوپال کی سلطان جہاں بیگم(۱۸۳۸ء۔۱۹۰۱ء)کا نام بھی بہت اہم ہے،جنھوں نے مدرسہ وکٹوریہ،مدرسہ بلقیسیہ اور مدرسہ سلطانیہ کے نام سے تعلیمِ نسواں کے ضمن میں مدرسے کھولے ۔[۲۵]مگر اس عہد میں جس شخص نے عورتوں کی تعلیم کے حق میں کھل کر اظہارِ خیال کیا،وہ مولانا الطاف حسین حالی تھے۔واضح رہے کہ برصغیر میں تانیثی شعور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہی طلوع ہوا، جس کا پہلا پڑاؤ انجمن پنجاب (۱۸۷۴ء) تھا،جس کے ذریعہ حالی نے تعلیمِ نسواں کے ضمن میں "چپ کی داد" اور "مناجاتِ بیوہ" ایسی شاہ کار نظمیں لکھ کر عورتوں میں تعلیم کے متعلق بے داری پیدا کرنے کی سعی کی اور عورتوں کو اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی راہ دکھائی۔اِس تناظر میں دیکھا جائے تو مولانا حالی ہی اُردو کے پہلے تانیثی ادیب قرار پاتے ہیں۔بعینہٖ علامہ اقبال(۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)نے بھی اپنے کلام میں اکثر و بیشتر عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے اپنی نظموں میں اظہارِ خیال کیا ہے:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

قطع نظر تمام خیالات و نظریات کے راست یہی ہے کہ عورتوں کے حقوق کے ضمن میں سب سے پہلے خواتین نے ہی قلم اُٹھایا۔ اس ضمن میں لاہور سے محمدی بیگم (۱۸۷۸ء۔۱۹۰۸ء) نے ۱۸۹۸ء میں "تہذیبِ نسواں"(۲۷) کے ذریعے عورتوں میں تانیثی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ بعینہٖ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالے "خاتون" جب کہ ۱۹۰۸ء میں دہلی سے جاری ہونے والے رسالے "عصمت" کو بھی نسائی شعور کی آبیاری کے ضمن میں تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اِسی طرح نذر سجاد حیدر (۱۸۹۲ء۔۱۹۶۷ء)، آصف جہاں، ض حسن بیگم اور انجمن آرا ایسی لکھاری خواتین کی افسانوی تحریریں بھی آزادیِ نسواں کے ضمن میں خاص اہمیت کی حامل ہیں، تاہم تعلیمِ نسواں سے متعلق معلومات شائع کرنے والا پہلا اخبار "خون" تھا، جو ۱۸۶۹ء میں آگرہ سے جاری ہوا۔(۲۸) اِسی طرح منشی محبوب عالم (۱۸۶۲ء۔۱۹۳۷ء)، جو تعلیمِ نسواں کے بہت بڑے داعی تھے۔ اُنھوں نے تعلیمِ نسواں کے ضمن میں مضمون نویسی کے مقابلہ جات کروائے، جو اُن کے اخبار "پیسہ اخبار" میں بھی شائع کیے جاتے تھے۔ اور تو اور بعد میں مولوی صاحب نے اُن مضامین کو کتابی صورت میں بھی شائع کیا۔ واضح رہے کہ ان مضامین کے ساتھ لکھاری خواتین کے نام تو درج نہیں تھے، تاہم ان مضامین کے بارے میں بعض مردوں کی مستند شہادتیں موجود ہیں کہ یہ خواتین کے ہی لکھے ہوئے تھے۔(۲۹) بعینہٖ ۱۸۸۴ء میں محب حسن نے دکن سے رسالہ "معلم" کو "معلم النسا" کا نام دے کر تانیثی فکر و خیال سے ہم آہنگ کر دیا۔ ازاں بعد طبقہ اناث کے کئی ایک رسائل جاری ہوئے، جن میں عیسائی مبلغین کی جانب سے ۱۸۸۴ء میں لکھنؤ سے جاری کردہ رسالہ "رفیقِ نسواں"، ۱۸۸۴ء میں ہی مولوی سید احمد دہلوی (۱۸۴۶ء۔۱۹۱۸ء) کا دہلی سے جاری کردہ اخبار "اخبار النسا"، لاہور سے منشی محبوب عالم محب کی جانب سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہونے والا اخبار "شریف بیبیاں"، پھر ۱۹۰۰ء میں میرٹھ سے نذیر احمد سعد کا "سفیرِ قیصر"، ۱۹۰۰ء میں ہی لکھنؤ سے عبدالحلیم شرر کا "پردۂ عصمت"، علاوہ ازیں ۱۹۰۹ء میں بھوپال سے "الحجاب"، ۱۹۱۱ء میں دہلی سے تمدن، ۱۹۱۳ء میں بھوپال سے "ظلِ سلطان"، ۱۹۱۵ء میں دہلی

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

سے "سہیلی"،۱۹۱۹ءمیں دہلی سے "استانی"اور حیدرآباد سے ۱۹۲۰ء میں "النسا" ایسے رسائل و جرائد میں خواتین کے سماجی تہذیبی اور تعلیمی مسائل کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ۔ (۳۰)

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اوّل اوّل اُردو ادب میں تانیثی خیالات کا وجود اُنیسویں صدی کی خواتین لکھاری خواتین کی نگارشات میں نظر آنا شروع ہوا۔ گو کہ تانیثی خیالات و نظریات کے اظہار کی پرورش مذکورہ صدی میں خاصی سست روی کا شکار رہی، تاہم بیسویں صدی میں یہ سلسلہ کسی قدر سرعت سے نمو پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ اِس عہد کو ہم تانیثی ادب کے فروغ کا باقاعدہ دورِ اوّل قرار دے سکتے ہیں۔ اس دور میں لکھاری خواتین اپنی تخلیقات کو اپنے نام سے شائع کروانے میں گریز برتا کرتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں زیادہ تر پردہ نشین تخلیق کار خواتین نے اپنی تحریروں کو شائع کرواتے ہوئے فرضی یا قلمی ناموں کا سہارا لیا۔ مثال کے طور پر ز۔خ۔ش نے زاہدہ خاتون شیروانی (۱۸۹۴ء۔۱۹۲۲ء)، بیگم شاہ نواز(۱۸۹۶ء۔۱۹۷۹ء) نے مسز عبدالقادر (۱۸۹۸ء۔۱۹۷۶ء)، الف۔ض حسین بیگم، نے روشن بیگم، عباسی بیگم نے زبیدہ بیگم، طیبہ بیگم (پ:۱۹۵۹ء) نے انوری بیگم، اور ب سدید نے بیاضِ سحر کے فرضی ناموں سے اپنا فکری سرمایہ قارئین کے سامنے پیش کیا۔ علاوہ ازیں بیگم صالحہ عابد حسین (۱۹۱۳ء۔۱۹۸۸ء)، ہمشیرہ غلام السیدین، ہمشیرہ ابوالکلام آزاد، ہمشیرہ احمد علی، بنت الباقر، والدہ افضل علی کی صورت میں بھی بعض خواتین اپنی نامکمل یا مبہم شناخت کے ساتھ رسائل و جرائد اوراخبارات میں اپنی رائے کا اظہار کیا کرتی تھیں۔ اِس دور کی دیگر اہم ترین تخلیق کار خواتین میں رشیدۃ النسا، احمدی بیگم ، حسینی بیگم، امراؤ بیگم، خیر النسا، بیگم ممتاز جہاں، بیگم فاطمہ محمدی، بلقیس جہاں، امت الحمید خانم، اخلاق فاطمہ، محمودہ بیگم، حمیدہ بیگم، خدیجۃ الکبریٰ، حمیدہ بانو، مسز عبداللہ سلطان بیگم، عطیہ فیضی، خجستہ اختر اور ضیا بیگم کے نام بہت اہم ہیں، تاہم اُردو ادب میں تانیثیت کی پہلی مضبوط اور توانا آواز ڈاکٹر رشید جہاں(۱۹۰۵ء۔۱۹۵۲ء) کی تھی، جو ترقی پسند تحریک سے عملی طور پر منسلک تھیں، اُنھوں نے اپنی تخلیقات میں مسلمان عورتوں کے مسائل کو اُجاگر کرنے کی زبردست مساعی کی۔

ازاں بعد نسائی فلسفہ کی ترویج و اشاعت کے ضمن میں عصمت چغتائی (۱۹۱۵ء۔۱۹۹۱ء) کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے، جن کی تخلیقات میں وفادار بیویوں ، فرماں بردار بیٹیوں اور کم سنی میں لڑکیوں کی شادی کے مضر اثرات کو بڑی جرات مندی و بے باکی کے صیغے میں بیان کرنے کا رُجحان ملتا ہے، جب کہ رضیہ سجاد ظہیر (۱۹۱۷ء۔۱۹۷۹ء) کی نگارشات میں عورت کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کے ساتھ ساتھ اُس کی روزمرہ زندگی کے نفسیاتی مسائل کو بڑے موثر پیرائے میں پیش کیا گیاہے، جب کہ قرۃالعین حیدر (۱۹۲۷ء۔۲۰۰۷ء) کی تخلیقات سیاسیات، سماجیات

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

، تہذیب و ثقافت اور فلسفہ و تاریخ کے آئینے میں عورت کے مسائل کی پردہ دری کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، بعینہٖ بانو قدسیہ (۱۹۲۸ء۔۲۰۱۷ء) نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں عورت سے متعلق جملہ نفسیاتی اُلجھنوں کو آشکار کرنے کی سعی کی ہے، اِسی طرح بشریٰ رحمٰن (پ:۱۹۴۴ء) کے ہاں نسائی حقوق کے ضمن میں شائستہ اور شستہ انداز میں احتجاج کی کیفیت ملتی ہے، جب کہ دیگر تانیثی فکر کی حامل خواتین تخلیق کاروں میں صغریٰ ہمایوں مرزا(۱۸۸۴ء۔۱۹۵۹ء)، حجاب امتیاز علی تاج (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۹۹ء)، امرتا پریتم (۱۹۱۹ء۔۲۰۰۵ء)، ممتاز شیریں(۱۹۲۴ء۔ ۱۹۷۳ء)، خدیجہ مستور (۱۹۲۷ء۔ ۱۹۸۲ ء)، الطاف فاطمہ (۱۹۲۷ ء ۔ ۲۰۱۸ء)، نثار عزیز بٹ(۱۹۲۷ء۔۲۰۲۰ء)، ہاجرہ مسرور(۱۹۳۰ء۔ ۲۰۱۲ء)، جمیلہ ہاشمی(۱۹۳۴ء۔۱۹۸۸ء)، رضیہ فصیح احمد(پ:۱۹۳۴ء)، واجدہ تبسم(۱۹۳۵ء۔ ۲۰۱۰ ء)، جیلانی بانو(پ:۱۹۳۶ء)، صغرا مہدی(۱۹۳۷ء۔۲۰۱۴ء)، خالدہ حسین(۱۹۳۷ء ۔۲۰۱۹ء) ، فرخندہ لودھی (۱۹۳۷ء۔ ۲۰۱۰ء) اور ذکیہ مشہدی(پ:۱۹۴۴ء) کے نام بہت اہم خیال کیے جاتے ہیں ۔نسائی طرزِ فکر کی حامل خواتین کو سماجی و ادبی دونوں سطحوں پر سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ آزادیِ نسواں کے سلسلے میں ان کی فکری و ادبی نگارشات کو مذہب و ملت کے خلاف قرار دیا گیا۔ نہ صرف یہ بل کہ ان ادیب خواتین کو مغرب زدہ اور جنسی آزادی کا طلب گار تک ہونے کا طعنہ دیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد نثر کے ساتھ شاعری کے میدان میں بھی خواتین نے اپنے حقوق کی جنگ کو بہادری سے جاری رکھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جن شاعرات نے خواتین کے حقوق کے لیے صنفِ شاعری کا سہارا لیا، اُن میں رابعہ پنہاں(۱۹۰۶ء۔ ۱۹۷۲ء)، صفیہ شمیم ملیح آبادی(۱۹۲۰ء ۔ ۲۰۰۸ء) ادا جعفری(۱۹۲۴ء ۔ ۲۰۱۵ء)، ساجدہ زیدی(۱۹۲۷ء۔۲۰۱۱ء)، زاہدہ زیدی(۱۹۳۰ء۔۲۰۱۱ء)، شفیق فاطمہ شعریٰ(پ:۱۹۳۰ء)، پروین فنا سید(۱۹۳۶ء۔ ۲۰۱۰ء)، زہرہ نگاہ(پ:۱۹۳۷ء)، کشور ناہید(پ:۱۹۴۰ء)، شبنم شکیل(۱۹۴۲ء۔۲۰۱۳ء)، فہمیدہ ریاض(۱۹۴۶ء۔ ۲۰۱۸ ء)، عذرا عباس(پ:۱۹۵۰ء)، یاسمین حمید(پ:۱۹۵۱ء) پروین شاکر(۱۹۵۲ء۔ ۱۹۹۴ء)، فاطمہ حسن (پ:۱۹۵۳ء)، سارا شگفتہ(۱۹۵۴ء۔۱۹۸۴ء)، شاہین مفتی(پ:۱۹۵۴ء)، عشرت آفریں (پ:۱۹۵۶ء)، منصورہ احمد(۱۹۵۸ء۔۲۰۱۱ء)، ثمینہ راجہ(۱۹۶۱ء۔ ۲۰۱۲ء) نسرین انجم بھٹی(۱۹۶۳ء۔۲۰۱۶ء) اور نوشی گیلانی(پ:۱۹۶۴ء) کے نام بہت اہم ہیں، جنھوں نے عورتوں کے مسائل کو اپنے اشعار میں کمال ہنر مندی سے پیش کیا۔ ان تمام شاعر خواتین کے کلام میں باعتبارِ موضوع اور طرزِ اظہار کے تانیثی فکر و خیال کی احتجاجی صدائیں بہ خوبی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ ان شاعرات نے عورتوں کے جذبات واحساسات کو اپنے کلام کے ذریعے کسی

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

قدر بلند آہنگی اور بے باکی کے پیرائے میں پیش کیا، جس کی وجہ سے ان خواتین شاعرات کے خلاف سخت برہمی کا رویہ بھی اختیار کیا گیا، تاہم اِس کے باوجود خاص طور پر کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری میں عورتوں کے مسائل کو دبنگ انداز میں پیش کیا۔ مجموعی سطح پر ان دونوں شاعرات کی شاعری آج کی عورت کے مسائل کا بہترین نقشہ پیش کرتی ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان میں نسائی تحریک کی باقاعدہ علم برداری کا سہرا کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے سر ہے۔[۳۱] علاوہ ازیں نسائیت پسند ادیب وارث میر(۱۹۳۸ء۔ ۱۹۸۷ء) نے بھی "کیا عورت آدھی ہے؟" کے ذریعے اور ممتاز مفتی(۱۹۰۵ء۔ ۱۹۹۵ء) نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے مسائل اور حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے ان مرد لکھاریوں کو بھی سخت ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا۔

مندرجہ بالا گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ آزادی سے کام کرنے اور اپنے اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے،یعنی عورتوں کو مردوں سے کم تر نہ سمجھا جائے اور اُنھیں حقِ مساوات کے اصول پر تمام انسانی حقوق بغیر کسی امتیاز کے دیے جائیں، تاکہ عورت صدیوں کو محیط احساسِ کم تری کی کیفیت سے باہر نکل کر ایک آزاد انسان کی طرح اپنی مرضی سے اپنی ذات کے بارے میں اپنا ہر فیصلہ کر سکے۔ کہا جا سکتا ہے کہ تانیثی شعور نے ہی خواتین کو تاریکی اور جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکل کر روشن خیال دُنیا سے رُوشناس کروانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تانیثی شعور کا یہ تصور ادب و شعر اور فنون لطیفہ کی ہر شاخ میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تانیثی شعور کے آغاز سے لے کر تانیثی تحریک کی ترقی و ترویج کے موجودہ دور تک ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد آج عورت کے لبوں پر اپنے فطری اور جائز مطالبات کے حق میں بڑی دلیرانہ آوازیں سنائی دے رہی ہیں، جن میں عزم و یقین کا رنگ بڑے واضح انداز میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے میں عورت کو صدیوں کا ایک کٹھن سفر طے کرنا پڑا ہے، گویا عورت کے ظاہر و باطن میں شعورِ ذات کا تدریجی ارتقا ایک لمبے اور اُن تھک سفر کا نتیجہ ہے، جس کی بہ دولت آج کی عورت اپنے حقوق کے لیے بہت پر عزم اور نڈر ہو چکی ہے، مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ علم و فن اور سائنسی ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود آج بھی دنیا کی اسی فی صد خواتین اپنے جائز حقوق سے نہ صرف نابلد ہیں، بل کہ وہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو بھی نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس اپنی موجودہ حالت کو قسمت کا لکھا سمجھ کر راضی بارضا ہیں۔ چوں کہ ہمارے سماج میں عورت جبر و استبداد کا شکار رہی ہے ،اِس لیے ضروری ہے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے پہلے اُسے ظلم و زیادتی کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔[۳۲]

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

مجموعی سطح پر کہا جا سکتا ہے کہ آزادیِ نسواں کی تحریک وطن عزیز میں اِس سطح پر فعّال دکھائی نہیں دیتی، جس طرح مغربی سماج میں یہ اپنا بھرپور کردار ادا کرتی چلی آرہی ہے۔اِس کی بنیادی وجہ تو عورتوں میں شرحِ خواندگی کا انتہائی کم ہونا ہے، جس کی وجہ سے ہماری عورت آج بھی سماج کے مرکزی دھارے سے کٹی ہوئی ہے، جب کہ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارا سماج اب تک اس بات کو سمجھ ہی نہیں پایا کہ عورت آخر اپنے سماج سے چاہتی کیا ہے اور وہ ایسے کون سے حقوق ہیں، جنھیں وہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ تانیثی شعور کی حامل تحریک ہماری سوسائٹی کے ہاتھوں تضحیک و تمسخر کا شکار بنی رہی ہے۔اِس امر میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ عورت نہ تو اپنے بنیادی وظیفۂ حیات سے انکاری ہے اور نہ ہی وہ اخلاقی پابندیوں سے بے مہار آزادی کی خواہاں ہے، بل کہ وہ چاہتی ہے کہ مذہب و ملت اور آئینِ پاکستان نے جو حقوق اُسے عطا کیے ہیں، کم از کم وہ اُس کی جھولی میں ضرور ڈال دیے جائیں اور اِس سے زیادہ وہ کچھ نہیں چاہتی۔

حوالہ جات

۱۔قدیر انجم باجوہ، "تانیثیت (Feminism) کی تحریک"، مشمولہ، اُردونامہ،(اپریل تا ستمبر ۲۰۱۱ء)جلد:۳۰، شمارہ:۲،۳، ص ۴۰

۲۔آمنہ تحسین، ڈاکٹر، مطالعاتِ نسواں،(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۸ء)، ص ۹۳

۳۔قیصر الاسلام قاضی، فلسفے کے جدید نظریات،(لاہور:اقبال اکادمی،۱۹۹۸ء)، ص ۵۷۴

۴۔شازیہ عنبرین ڈاکٹر، "نسائی تحریک ادبی تناظر میں"، مشمولہ، جرنل آف ریسرچ(،جون ۲۰۱۲ء)، شمارہ:۲۱، ص ۱۹۷

۵۔ آزاد ایوب بٹ، "تانیثیت اور اُردو ادب"، مشمولہ، اُردو اسکالرس کی دُنیا،(، نومبر ۲۰۱۸ء) جلد:۶، ش مارہ:۴، ص ۹۵

۶۔رخسانہ بلوچ، ڈاکٹر، "عالمگیریت:تانیثی شعور کے تناظر میں"، مشمولہ، تحقیقی جریدہ، شمارہ:۵، ص ۱۴۴

۷۔ نسیم عباس احمر، "مغربی تانیثی مفکرین اور تانیثی اصطلاحات"، مشمولہ، ماہ نامہ ادبِ لطیف، (،جون ۲۰۱۰ء) جلد:۷۵، شمارہ:۶، ص ۱۴

۸۔ضمیر علی بدایونی، مابعد جدیدیت کا دوسرا رُخ،(کراچی:شہرزاد،۲۰۰۶ء)، ص ۲۷

۹۔خلیل احمد بیگ مرزا، ادبی تنقید کے لسانی مضمرات،(علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۲ء)، ص ۵۷

۱۰۔ شمس الرحمن فاروقی، "تانیثیت Feminism کی تفہیم"، مشمولہ، سہ ماہی ادبیات (انتخاب)۔ خواتین کا عالمی ادب، س۔ن، ص ۱۷

۱۱۔ عتیق اللہ، ڈاکٹر، تعصّبات، (دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۱۱

۱۲۔ وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت مضمرات و امکانات، (اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۳۲

۱۳۔ ریاض احمد، تصدیق، مرتبہ: ڈاکٹر اسلم رانا، (لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۳۵

۱۴۔ جان نثار مومن، "تانیثیت چند بنیادی مباحث"، مشمولہ، اُردو ریسرچ جرنل، (اپریل تا اگست ۲۰۱۵ء) شمارہ: ۱، ص ۵۷

۱۵۔ نبیل احمد نبیل، ڈاکٹر، "تانیثیت چند معروضات"، مشمولہ، مجلّہ تحقیق، (جنوری مارچ ۲۰۱۶ء) جلد: ۳۷، شمارہ: ۱۰۲، ص ۷۷

۱۶۔ ضمیر علی بدایونی، "ژولیا کرسٹیوا: نسائی شعور کے عروج کی علامت"، مشمولہ، خاموشی کی آوازیں، مرتبین، فاطمہ حسن، آصف فرخی، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۳ء)، ص ۹۹

۱۷۔ امتیاز احمد، " ادب کی نسائی رِدِ تشکیل ایک مطالعہ"، مشمولہ، سہ ماہی فکر و نظر، (دسمبر ۲۰۰۹ء) جلد: ۴۶، شمارہ: ۴، ص ۷۷

۱۸۔ محمد عقیل، سیّد، اصولِ تنقید اور ردِ عمل، (الہ آباد: انجمنِ تہذیبِ نو پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۶۴

۱۹۔ ترنم ریاض، بیسویں صدی میں خواتین کا اُردو ادب، (دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۴ء)، ص ۸

۲۰۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء)، ص ۵۰

۲۱۔ محمود شیخ، "تانیثیت اور اخلاقیات"، مشمولہ، ماہ نامہ شاعر، (اگست ۲۰۱۳ء) جلد: ۸۴، شمارہ: ۸، ص ۳۶

۲۲۔ بعض محققین کے نزدیک لطف النسا امتیاز کا مجموعہ ۱۷۹۷ء میں، جب کہ مہ لقا چندہ بائی کا ۱۷۹۸ء میں مرتب ہوا۔

۲۳۔ افضال حسین، قاضی، تحریر اساس تنقید، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۲۵

۲۴۔ فہمیدہ حسین، ڈاکٹر، شاہ لطیف کی شاعری میں عورت کا رُوپ، (حیدرآباد: بھٹ شاہ ثقافتی مرکز، ۱۹۹۶ء)، ص ۵۵۰

۲۵۔ انیس ناگی، "ادب اور نسائیت کا مسئلہ"، مشمولہ، پاکستانی ادب ۲۰۰۸، (نثر)، مرتب: ڈاکٹر شاہین مفتی، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۸۷

۲۶۔ سیمیں ثمر فضل، ڈاکٹر، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اُردو ناول کا حصہ، (کلکتہ: آبادی پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۱۸

۲۷۔ تہذیبِ نسواں کے ایک ہزار کے قریب شمارے شائع ہوئے۔

۲۸۔ جمیل اختر، اُردو میں جرائدِ نسواں کی تاریخ (حصہ اوّل)، (دہلی: کتابی دُنیا، ۲۰۱۶ء)، ص ۵۳

۲۹۔ رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، اُردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ، (حیدرآباد: مجلسِ تحقیقاتِ اُردو حمایت نگر، س۔ن)، ص ۱۸۳

۳۰۔ فرزانہ اقبال، "اصلاحِ نسواں اور تعلیمِ نسواں میں خواتین مضامین نگار کا کردار: ایک اجمالی جائزہ"، مشمولہ، مجلّہ اُردو زبان و ادب، (جون، دسمبر ۲۰۱۷ء) جلد: ۱، شمارہ: ۱، ص ۱۵۶، ۱۵۷

۳۱۔ شاہین مفتی، "ترغیبِ نسوانی سے تحریکِ نسوانی تک"، مشمولہ، ماہ نامہ شاعر، (مارچ، ۲۰۰۸ء) جلد: ۷۹، شمارہ: ۳، ص ۲۱

۳۲۔ کشور ناہید، عورت مرد کا رشتہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۲